محمد اسحٰق بھٹی

الفتاویٰ الغیاثیہ

سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کا ایک فقہی مخطوطہ

فتاویٰ غیاثیہ کے بارے میں جون ۱۹۶۹ء کے "المعارف" میں راقم السطور نے ایک مضمون لکھا تھا، لیکن وہ مضمون مختصر تھا اور اس اہم فتاویٰ کے مندرجات کے تمام پہلوؤں کو محیط نہ تھا۔ پیش نظر مضمون میں اس کے مشمولات و محتویات سے متعلق بہت سی تفصیلات دی گئی ہیں۔

الفتاویٰ الغیاثیہ فتاویٰ کا پہلا مجموعہ ہے جو ساتویں ہجری میں ہندوستان میں سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں معرضِ تحریر میں لایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے، اس سے قبل اس برصغیر میں اس انداز سے مسائلِ فقہ کے جمع و تدوین کی علما کو عادت نہ تھی۔ اس سے پہلے کی اس نوع کی کوئی کتاب — جو اس خطۂ ارض میں مرتب کی گئی ہو — ہمارے علم میں نہیں آئی۔ افسوس ہے یہ فتاویٰ ناقص ہے، اس کے بہت سے اوراق دستبردِ زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں۔ فہرستِ مضامین کے کئی ابواب کتاب میں موجود نہیں۔ اگر فتاویٰ کا یہ مجموعہ مکمل صورت میں موجود ہوتا تو ہندوستان کی تاریخِ فقہ میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہوتی۔ تاہم اب بھی اس کا فقہی درجہ بڑا بلند ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی ہندوستان میں فہمِ مسائل کا کیا اسلوب تھا، اس دور میں کس قسم کے امور عوام اور حکمران طبقہ کو درپیش تھے اور وہ ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے تھے۔ اس قسم کی کتابیں ہماری فقہی، علمی اور ثقافتی روایات کو مستحکم کرنے، انھیں اسلامی معاشرہ میں ترویج دینے اور قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور حال کے رشتے کو ماضی سے جوڑنے میں مدد دیتی ہیں۔

فتاویٰ کا یہ مجموعہ مسائلِ حنفیہ کو محیط ہے اور اس میں ان افکار و آرا کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا ہے جن سے حنفی فقہ کی توثیق و وضاحت ہوتی ہو۔ اس کے مآخذ بھی حنفی فقہ پر مشتمل ہیں۔

اور تمام مسائل اسی کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔ کیونکہ اُس دَور میں یہاں حنفی فقہ ہی رواج پذیر تھی اور مسلمان معاشرہ کے عوام و خواص اسی کی طرف رجوع کرتے تھے۔

فتاویٰ غیاثیہ کی مقبولیت و رجعیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دیارِ سندھ کے دسویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ و امام علامہ محمد جعفر بن علامہ عبدالکریم الشہیر بمیران بن یعقوب بوبکانی سندھی نے اپنی معروف فقہی تالیف المتانۃ فی مرتۃ الخزانۃ میں بے شمار مقامات پر اس کا بطور حوالے کے ذکر کیا ہے اور متعدد فقہی مسائل اس سے اخذ کیے ہیں[1]۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتاویٰ جو ساتویں صدی ہجری میں معرضِ تصنیف میں لایا گیا، دسویں صدی ہجری تک علما و فقہا میں متداول تھا اور وہ اس سے استفادہ کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے پنجاب یونیورسٹی کا جو مخطوطہ ہمارے پیشِ نگاہ ہے، وہ چونکہ ناقص ہے، اس لیے بہت سے مسائل جن کا حوالہ متانہ میں دیا گیا ہے، اس میں موجود نہیں!

۸۲ اوراق کے اس ناقص و نامکمل مخطوطے میں جو مسائل بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے چند مسائل ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

فاسق و مبدع کی امامت میں نماز

مصنف نے ایک فصل کے تحت ایک عنوان قایم کیا ہے "فی الامامۃ والاقتداء بالصلوٰۃ خلف اھل الفسق والبدعۃ" اس میں یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مبدع اور فاسق کی امامت میں نماز ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادا کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ مصنف کے الفاظ یہ ہیں:۔

اذا صلّی خلف فاسق او مبدع وھو ممن یجوز الصلوٰۃ خلفہ فانہ ینال فضل الجماعۃ لقولہ علیہ السلام۔ صلّ خلف کل بر و فاجر[2]۔

"کوئی شخص فاسق اور اہلِ بدعت کی امامت میں نماز پڑھے (تو اس میں کوئی حرج نہیں)

---

[1] المتانۃ فی مرتۃ الخزانۃ سندھی ادبی بورڈ کراچی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے اور یہ کتاب فقہی مسائل کا قابلِ ذکر مجموعہ ہے۔

[2] ورق ۲۲

[illegible] کیا جائے گا۔ ایسا امام ان لوگوں میں سے ہے جن کی امامت میں نماز پڑھنا جائز ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔
"ہر نیک اور بد کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔"

یہ چیز مصنف کی وسعتِ ظرف کا پتہ دیتی ہے۔ نیز بتاتی ہے کہ وضاحت مسائل میں ارشاداتِ پیغمبری ان کے پیش نظر ہیں۔ (اگرچہ ہر جگہ اس کا التزام نہیں کیا گیا)

نمازِ جمعہ اور اس کی شرائط

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا فتاویٰ کا یہ مجموعہ فقہ حنفی کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور اس کے ماخذ کتب احناف ہیں۔ مثلاً نماز جمعہ کہاں پڑھنا چاہیے اور اس کی کیا شرائط ہیں۔ یہ فقہ کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ فقہائے حنفیہ کے نزدیک جمعہ کی ادائیگی چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے "جمعہ فی القریٰ" ان کے نزدیک جائز نہیں۔ وہ نماز جمعہ کو شہر اور مصر کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور پھر یہ وضاحت کرتے ہیں کہ شہر کیا ہوتا ہے اور مصر کی تعریف کیا ہے اور اس کا اطلاق کس مقام پر کیا جا سکتا ہے۔ "باب الجمعۃ وشرائطها" میں مصنف شہیر فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے امام سرخسی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

قال شمس الائمة السرخسيؒ ظاهر المذهب ان المصر الجامع ما فيه جماعات الناس واسواق التجارات وسلطان او قاضي يقيم الحدود وينفذ الاحكام اي يقدر على ذلك ويكون ثمه مفتي۔ ان لم يكن القاضي والسلطان بنفسه مفتي۔ اذا وقع الشك في وجود شرائطه ينبغي لاهله ان يصلوا بعد الجمعة اربعا بنية الظهر[1]

یعنی شمس الائمہ سرخسی فرماتے ہیں ظاہر مذہب کی رو سے مصر جامع وہ ہے جس میں لوگوں کا ہجوم آباد ہو۔ مختلف چیزوں کی تجارت کے بازار ہوں اور سلطان، یا قاضی ہو، جو حدود قائم کرتا اور احکام کا نفاذ کرتا ہو یعنی حدود قائم کرنے

---

[1] ورق ۳۲

اور احکام کے اجرا و تنفیذ پر قادر ہو، نیز اس میں مفتی متعین ہو۔ اگر قاضی نہ ہو تو خود سلطان کی حیثیت مفتی کی سی ہے۔ اگر ان شرائط کا وجود ثابت و متحقق ہونے میں شک پیدا ہو جائے تو وہاں کے رہنے والوں کو چاہیے کہ جمعہ کے بعد ظہر کی نیت کر کے چار رکعت نماز پڑھ لیں۔

مصنف کی عبارت کا مطلب ظاہر ہے۔ وہ یہ فرما رہے ہیں کہ جس شہر میں یہ شرائط نہ پائی جاتی ہوں، اس میں جمعہ نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر پڑھ لیا گیا اور بعد میں شک پڑ گیا کہ یہ شہر ان شرائط سے محروم ہے تو سمجھ لیجیے جمعہ نہیں ہوا۔ نمازیوں کو چاہیے کہ ظہر کی نماز ادا کریں۔

مسائل میں حالات کی رعایت

مصنفِ علّام نے جس دور میں یہ کتاب تصنیف کی وہ عالم اسلامی کے لیے بدرجہ غایت کرب و آلام کا دور تھا۔ تاتاریوں نے مسلمانوں پہ عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ہر سو فتنہ و فساد پھیلا ہوا تھا۔ راستے منقطع ہو چکے تھے اور مسلمانوں کے لیے حج کا سفر انتہائی مشکل ہو گیا تھا چنانچہ "کتاب الحج" کے ضمن میں مسائلِ حج بیان کرتے ہوئے مصنف نے اپنے گرد و پیش کے حالات کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے اور مشائخ بلخ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال جماعة من مشائخ بلخ ان الحج لیس بفریضة فی زماننا۔[1]

مشائخ بلخ کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ہمارے زمانے میں حج فرض نہیں رہا۔

وجوب حج کی شرائط میں راستوں کا امن بھی شامل ہے۔

مصنف حج کے سلسلے میں دیگر شرائط کے ساتھ راستوں کے امن و حفاظت کو بھی وجوب حج کے لیے ضروری شرط قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

وفی الجملة امن الطریق من شرائط الوجوب بلا خلاف وخوف الطریق کعدم الزاد والراحلة۔ فالمختار ما قال الفقیه ابو اللیث ان الامن فی الطریق اذا کان غالباً یجب والا فهو ساقط۔[2]

یعنی فی الجملہ بلا کسی اختلاف کے (حج کے) شرائطِ وجوب میں سے راستوں کا

---

[1] ورق ۶۰ ب
[2] ایضاً

محفوظ و مامون ہوتا ہے۔ راستے کے خوف و خطر کی حیثیت بالکل وہی ہے جو زاد راہ اور سواری کے فقدان کی ہے۔ اس باب میں پسندیدہ بات وہی ہے، جو فقیہ ابو اللیث نے کہی کہ جب راستے کے امن و امان کا پہلو زیادہ غالب ہو تو حج واجب ہوتا ہے۔ ورنہ ساقط ہو جاتا ہے۔

حجِ ثانی کے بارے میں

ایک مرتبہ انسان اگر فریضۂ حج سے سبکدوش ہو جائے تو دوسری مرتبہ (حج نفل) ادا کرنے کے بارے میں مصنف کی رائے یہ ہے کہ حج کے بجائے اتنی رقم کا صدقہ ادا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

من حج مرة فاراد ان یحج اخری فالمختار ان الصدقة افضل لان نفعها متعد بخلاف الحج[1]

یعنی جو شخص ایک دفعہ فریضۂ حج ادا کر چکا ہو اور دوسری دفعہ ارادہ رکھتا ہو تو اس سلسلے میں مذہب مختار یہ ہے کہ وہی رقم مستحقین کو صدقہ کے طور پر دینا حجِ ثانی کی نسبت زیادہ افضلیت کا باعث ہے اور زیادہ اجر و ثواب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

سواری پہ حج کو جانا زیادہ افضل ہے یا پیدل؟

یہاں مصنفِ فتاویٰ نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ سواری پر حج کے لیے جانا زیادہ باعثِ فضیلت ہے یا دیارِ محبوب کو پیدل چل کر جانا اپنے اندر زیادہ اجر و ثواب کی مقدار لیے ہوئے ہے۔ مصنف فرماتے ہیں۔ پیدل کی نسبت سواری پر حج کو جانے میں زیادہ افضلیت پنہاں ہے۔ کیونکہ طویل اور دشوار گذار یا پیادہ سفر میں مسافرِ دیارِ رسول کو اس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ بسا اوقات اس کے خلق اور صحتِ جسم میں کئی نوع کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مصنف کے الفاظ یہ ہیں:۔

الحج راکبًا افضل من المشی کیلا یسوء خلقه بالجهد[2]۔

---

[1] ورق ۶۶م

[2] ایضاً

سواری پر حج کو جانا یا پیادہ جانے سے زیادہ باعثِ فضیلت ہے تاکہ سفر کی مشقت وصعوبت سے اس کے جسم میں کسی قسم کی بیماری اور نقص کے آثار نہ پیدا ہوں۔

طلاق کے سلسلے میں ایک دلچسپ نکتہ

فتاویٰ غیاثیہ کے فاضل مصنف نے ایک مقام پر طلاق کے بارے میں ایک دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

رجل قال لامرأته تلاق۔ هاهنا خمسة الفاظ تلاق وتلاغ وطلاغ وتلاك وطلاك عن الامام ابی بکر محمد بن الفضل ما کان یعنی فی الالفاظ الخمسة انه یقع وان تعمد وقصد ان لا یقع لا یصدق قضاءً صدق دیانةً[1]

یعنی ایک شخص اپنی بیوی کے لیے تلاق کا لفظ زبان سے ادا کرتا ہے یہاں اس قسم کے پانچ الفاظ ہیں: تلاق، تلاغ، طلاغ، تلاک اور طلاک۔ امام ابوبکر محمد بن فضل کہتے ہیں۔ ان پانچ میں اس کی مراد اگرچہ کچھ ہو، طلاق واقع ہو جائے گی لیکن اگر اس کا مقصد یہ ہے کہ طلاق نہ پڑے تو اس کی تصدیق قضائے قاضی سے نہیں ہوگی بلکہ اس کی دیانت سے ہوگی۔

مطلب یہ کہ اس کا ضمیر اور دیانت ہی اصل حقیقت سے پردہ اٹھائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی مصنف لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کے تلفظ کے بارے میں جھگڑا پڑ جائے تو ہم دیکھیں گے یہ لفظ بولنے والا کون ہے۔ عالم ہے یا جاہل۔؟ اگر عالم ہے اور الفاظ کے فرق کو جانتا ہے اور اس نے کسی وجہ سے بیوی کو ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے لیے تلاق یا طلاک کا لفظ زبان سے نکالا ہے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ پھر یہ بھی دیکھا جائے گا، کہ قائل عجمی ہے یا عربی۔ اگر عربی ہے اور اسے معلوم ہے کہ حرف کے مخرج سے معنی بدل

---

[1] ورق ۵۳

جاتا ہے تو بھی طلاق واقع نہیں ہو گی۔

کافر اور مظلوم

باب الاستحسان والکراہیۃ کی فصل اوّل کی "نوع فی الدعاء" میں مصنف نے اس بات پر بحث کی ہے کہ

الکافر اذا دعا اللہ اختلفوا فیہ انہ ھل یقال انہ دعاءہ یستجاب[1]؟

یعنی کافر کسی سلسلے میں اللہ سے دعا مانگے تو فقہا کے نزدیک اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس کے لیے یہ لفظ کہا جائے گا کہ اس کی دعا قبول کی گئی۔؟

مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ قبولیت دعا کا سلسلہ اہل اسلام سے ہے۔ دعا اور استجابت دونوں شرعی لفظ ہیں تو کیا فقہی لحاظ سے ان الفاظ کا انتساب کافر کی طرف ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مصنف فرماتے ہیں: حدیث میں ہے: "ان دعوۃ المظلوم مستجابۃ" "ان کان کافراً": "مظلوم کی دعا قبول کی جاتی ہے" اگرچہ وہ کافر ہو۔

یہ حدیث درج کرنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں: جب مظلوم کا لفظ عام ہے، کافر یا مومن کے ساتھ مختص نہیں تو ہر شخص کی دعا کے لیے اللہ کا باب اجابت وا ہے۔

قرآن کی تلاوت کرنے والے پر سلام کہنے کے بارے میں

کوئی شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو تو اس کو سلام کہنا چاہیے یا نہیں؟

مصنف لکھتے ہیں:

لا یسلم علی قاری القرآن لکیلا یشغلہ عنہ[2]

قرآن کی تلاوت کرنے والے کو السلام علیکم نہ کہا جائے تاکہ اس کی توجہ قرآن سے نہ ہٹ جائے اور وہ دوسری طرف مشغول ہو جائے۔

بادشاہ کو سجدہ نہ کیا جائے۔

مصنف نے باب الاستحسان والکراہیۃ کی فصل ثالث میں ایک نوع کا عنوان قائم

---

[1] ورق ۷۸

[2] ورق ۷۹

کیا ہے۔ "فی ملاقات الملوک" اس میں انھوں نے اس دور کی درباری بدعات اور غیر اسلامی رسوم و عوائد کی جرأت سے تردید کی ہے اور بادشاہ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی سخت مخالفت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

اذا قیل للمسلم اسجد للملک والا قتلناک فالافضل ان لا یسجد انہ کفر والافضل ان یحترز عما ھو کفر وان کان مکرھا[1]

کسی مسلمان کو اگر کہا جائے کہ بادشاہ کے سامنے سجدہ کرو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے تو افضلیت کا تقاضا یہ ہے کہ سجدہ نہ کرے۔ کیونکہ یہ کفر ہے اور افضل یہ ہے کہ کفر سے احتراز کیا جائے۔ اگرچہ اس کے لیے کتنا ہی مجبور کیا جائے۔

تعظیم سے ہاتھ چومنا

ساتھ ہی فرماتے ہیں:

تقبیل ید العالم والسلطان العادل جائز۔[2]

عالم کا اور سلطانِ عادل کا احتراماً ہاتھ چومنا جائز ہے۔

امیر کے سامنے کلمۂ حق کی اہمیت

اسی باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر امیر کسی کو اپنے ہاں طلب کرے اور اس انداز کی بات کرے کہ اس کا صحیح اور قرینِ صواب جواب دینے کی صورت میں سزا و عقوبت کا خطرہ لاحق ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ مصنف تحریر فرماتے ہیں:۔

یدعوہ الامیر ویسئلہ عن اشیاء فان تکلم بما یوافق الحق ینالہ مکروہ منہ فانہ لا ینبغی ان یتکلم بخلاف الحق ولا محل لہ ان یتکلم بما یوافق لہ لقولہ علیہ السلام من تکلم عند ظالم بما یرضیہ بغیر حق یغیر اللہ قلب الظالم علیہ ویسلط علیہ۔

اسے امیر اپنے ہاں بلاتا ہے اور اس قسم کے سوال کرتا ہے کہ اگر صحیح اور درست

---

[1] ورق ۷۹ [2] ایضاً

جواب دے تو اس کی طرف سے شر اور سزا کا خطرہ ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ خلافِ حق کوئی بات زبان سے نہ نکالی جائے اور اس امر کی کوئی گنجایش نہیں کہ وہ (امیر کو خوش کرنے کے لیے) اس کی مرضی کے مطابق بات کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص ظالم کے پاس اس کی مرضی کے مطابق ناحق اور غلط بات کہتا ہے تو اللہ (بطور سزا کے) ظالم کے دل کو اس کی طرف سے بدل دے گا اور اس کو اس پر مسلط کر دے گا۔

بادشاہوں کی خدمت میں حاضری

سلاطین و ملوک کے ہاں جانے کے سلسلے میں امام ابو اللیث کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

عن ابی اللیث الحافظ انہ کان یکرہ الدخول علی السلاطین و یفتی بذالک [1]

یعنی امام ابو اللیث سلاطین کے ہاں جانے کو برا سمجھتے تھے اور یہی فتویٰ دیتے تھے۔

احتیاط اور افضلیت

مصنف نہایت محتاط بزرگ ہیں۔ فرماتے ہیں۔ احتیاط اور افضلیت کا تقاضا یہ ہے کہ جنگل کے درختوں سے آندھی یا بارش کی وجہ سے جو پھل گرتا ہے وہ نہ کھایا جائے اور نہ راستے سے مٹی اکھاڑی جائے۔ نہ راستہ چلتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا جائے [2]

مقروض سے تحفہ قبول کرنے کے بارے میں

مقروض سے تحفہ وغیرہ قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ فرماتے ہیں:۔

المستقرض اذا اھدیٰ فالافضل ان لا یقبل اذا کان شیئاً لا یھدی من قبل [3]

یعنی قرضخواہ کے لیے افضلیت اسی میں ہے کہ اسے (مقروض کی طرف سے) تحفہ پیش کیا جائے تو قبول نہ کرے۔ جبکہ قبل ازیں اسے کوئی تحفہ نہیں پیش کیا جاتا تھا۔

---

[1] ورق ۱۔ [2] ورق ۸۰ [3] ایضاً

مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرض سے پہلے قرض خواہ اور مقروض کے درمیان تحائف کے باہمی مبادلہ کا سلسلہ جاری تھا تو تحفہ قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر قرض لینے کے بعد ہی تحفہ پیش کیا گیا ہے تو قبول نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ تحفہ سود کی تعریف میں آئے گا اور سود ہر صورت اور ہر شکل میں حرام ہے۔

بیت المال کے سلسلے میں

فتاویٰ غیاثیہ کے مصنف نے بیت المال و مصارفہ میں دیگر امور کے ساتھ اس بات کو بھی موضوع بحث ٹھہرایا ہے کہ بیت المال کی حفاظت کتنی ضروری ہے اور مسلمانوں کے اس اجتماعی خزانے سے کن لوگوں کی خدمت کی جا سکتی ہے اور یہ روپیہ معاشرہ کے کن افراد پر خرچ کرنا چاہیے اور پھر کس قسم کے لوگوں کو اس سے کوئی چیز دینا ممنوع ہے۔ لکھا ہے:

لیس للاغنیاء فی بیت المال نصیب هو المختار الا ان یکون عالما فرغ نفسه لتعلیم الناس القرآن والفقه او یکون قاضیا او مفتیا وقد صح ان علیا رض اعطی فقهاء حملة القرآن منه ومقدار ما یصرف الی مصرف، مفوض الی اجتهاد الوالی۔

یعنی مذہب مختار یہ ہے کہ بیت المال میں اغنیا کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ البتہ اس سے یہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے۔ (ایک) وہ عالم دین جس نے (دنیا کے تمام کام ترک کر کے) خود کو لوگوں میں قرآن اور فقہ کی تعلیم پھیلانے کے لیے فارغ کر لیا ہو (دوسرے) جو شخص قاضی یا مفتی ہو۔ کیونکہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حفاظ قرآن فقہا کو بیت المال سے رقوم عطا کیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص کی (بیت المال سے) کس مقدار سے مدد کی جائیگی؟ اس فیصلے کا انحصار والی کے اجتہاد پر ہے (وہ جتنی رقم مناسب سمجھے دے دے)

پیشگی اُجرت

مسائلِ فقہ میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے کام کی پیشگی اُجرت لے سکتا ہے

یا نہیں۔؟ مصنف نے اس سلسلے میں اسی باب میں لکھا ہے کہ لے سکتا ہے لیکن افضل یہ ہے کہ نہ لے۔ مصنف فرماتے ہیں:

اذا استعجل المصدق عمالتہ والقاضی رزقہ قبل الوجوب ان رای الامام ان یعطیہ جاز لکن الافضل ان لا یاخذ لانہ لا یدری ایعیش الی وقت الوجوب ام لا

اگر صدقہ جمع کرنے والا اپنی اُجرت اور قاضی اپنی تنخواہ پورے دن کرنے اور واجب متحقق ہونے سے پہلے پیشگی طلب کرے تو اس معاملے کا تعلق امام سے ہے۔ اگر وہ دے دے تو اس کا یہ عمل جائز گردانا جائے گا، لیکن افضل یہ ہے کہ وہ شخص پیشگی اجرت نہ لے، کیونکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اُجرت واجب ہونے تک وہ زندہ بھی رہے گا، یا نہیں۔؟

پیشگی اُجرت کے سلسلے میں فقہا نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کے ایک واقعہ کو بطور دلیل کے ذکر کیا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ایک بیٹے کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور وہ یہی کپڑے پہن کر حصول تعلیم کے لیے مکتب جاتا تھا۔ اُس کے ہم درس اس کا مذاق اڑاتے تھے کیونکہ وہ امیرالمومنین کے بیٹے کو اس قسم کے لباس میں دیکھنے کے عادی نہ تھے۔ بیٹا باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور نئے کپڑوں کا مطالبہ کیا۔ باپ کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ بیٹے کا مطالبہ پورا کر سکے۔ انھوں نے بیت المال کے خازن کی طرف رجوع کیا اور لکھا کہ میری تنخواہ کے حساب میں سے کچھ رقم پیشگی دی جائے تاکہ میں اپنے بیٹے کے لیے نئے کپڑے مہیا کر سکوں۔ خازن نے امیرالمومنین کے مکتوب کا جواب ان الفاظ میں دیا:

انا کنا نعمل لکم ما دمتم تامروننا بالطاعۃ۔ فاذا امرتمونا بالجور فانا لا نعمل لکم۔ تمہ انک ان ضمنت لی نفسک بان تعیش وتعمل للمسلمین الی راس الشھر وجھت الیک ما سالت۔

جب تک آپ ہمیں حکم دیتے رہیں گے ہم اطاعت کرتے رہیں گے لیکن جب آپ ہمیں ظلم و جور کا حکم دیں گے تو ہم نہیں مانیں گے (اب آپ کے مدعا کا جواب

یہ ہے کہ) اگر آپ مجھے ضمانت دیں کہ مہینہ ختم ہونے تک زندہ رہیں گے اور مسلمانوں کی (اسی طرح) خدمت کرتے رہیں گے تو جو کچھ آپ نے مانگا ہے، میں دینے کو تیار ہوں۔

خازن کا یہ مکتوب امیر المومنین نے پڑھا تو بیٹے سے کہا:

یٰبنی اذھب مع خلقانك، وان عیرك الصبیان فان اباك لا یقدر علی جدید ثیابك۔

اے بیٹے! اپنے انہی پھٹے پرانے کپڑوں میں جاؤ۔ اگر لڑکے تم پہ طعنہ زنی کرتے اور تمہارا مذاق اڑاتے ہیں تو یاد رکھو، تمہارا باپ تمھیں نئے کپڑے مہیا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔

اس سے فقہا نے استدلال کیا ہے کہ پیشگی رقم نہ لینا اولیٰ ہے لیکن اگر شدید ضرورت ہو تو کوئی حرج بھی نہیں!

کیا ہاشمی سید مالِ زکوٰۃ قبول کر سکتا ہے؟

باب ادا الزکوٰۃ میں مصنف نے زکوٰۃ و صدقہ کے مسائل بیان کیے ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ ہاشمی سادات کے خاندان کا کوئی فرد مالِ زکوٰۃ قبول کر سکتا ہے یا نہیں؟ مصنف تحریر فرماتے ہیں:۔

ویکرہ للھاشمی عند ابی یوسفؒ خلافا لمحمد وروی ابو عصمۃ عن ابی حنیفۃؒ انہ یجوز دفع الزکوٰۃ الی الھاشمی وانما کان لا یجوز فی ذلك الوقت۔

امام ابو یوسف کے نزدیک ہاشمی کے لیے زکوٰۃ قبول کرنا مکروہ ہے۔ لیکن امام محمدؒ اس کے خلاف ہیں (وہ کہتے ہیں، ہاشمی زکوٰۃ قبول کر سکتا ہے) ابو عصمہ امام حنیفہ رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہاشمی کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اس کا عدم جواز اُسی زمانے کے لیے مخصوص تھا۔ (اب کراہت کا یہ حکم باقی نہیں رہا)

صدقۂ فطر

باب صدقۃ الفطر میں مصنف فتاویٰ نے اس موضوع سے متعلق کچھ تفصیلات بیان کی

ہیں اور لکھا ہے کہ صدقۂ فطر عید کے روز نماز فجر کے بعد سے لے کر نمازِ عید پڑھنے سے پہلے ادا کر دینا چاہیے، تاکہ اس سے مساکین و مستحقین فائدہ اُٹھا سکیں، اور عام مسلمانوں کے ساتھ عید کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں۔ صحیح مسئلہ بھی یہی ہے اور اس پر سب لوگ عمل پیرا ہیں لیکن اس ضمن میں دیگر محدثین و فقہا کی طرح مصنف کے سامنے ایک اور نقطۂ نظر بھی ہے اور متعدد ذرائع شرعی سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر صدقۂ فطر عید کے روز ہی ادا کیا جائے تو اس سے غربا اور مساکین زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ وہ اس مختصر وقت میں نہ کپڑے خرید سکتے ہیں، نہ ضروری سامان مہیا کر سکتے ہیں اور نہ عام مسلمانوں کی خوشی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اگر عید سے کچھ روز پہلے ہی صدقۂ فطر ادا کر دیا جائے تو شریعت کا منشا بطریقِ احسن پورا ہو سکے گا، کیونکہ وہ عید تک اس رقم سے اپنی ضروریات بآسانی خرید سکتے ہیں۔ چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:۔

یجوز تعجیلھا اذا دخل شھر رمضان وھو اختیار الشیخ الامام ابی بکر محمد بن الفضل وعلیہ الفتویٰ

ماہ رمضان شروع ہوتے ہی صدقۃ الفطر ادا کر دینا جائز ہے اور شیخ امام ابوبکر محمد بن فضل کے نزدیک یہی پسندیدہ ہے اور یہی مفتیٰ بہا ہے۔

اقرارِ جرم میں الفاظ کا استعمال

فقہا نے اقرارِ جرم کے سلسلے میں اصل اہمیت ملزم کے الفاظ کو دی ہے اور اس کے الفاظ ہی کو فیصلے کا دارومدار قرار دیا ہے۔ فتاویٰ غیاثیہ کے مصنف کتاب السرقہ میں لکھتے ہیں جو شخص چوری کے الزام میں قاضی کے سامنے پیش ہوتا ہے اسے اسی صورت میں سزا دی جائے گی جب وہ مالِ مسروقہ کا نام لے کر کہے کہ میں نے یہ مال چوری کیا ہے۔ انا سارق ھذا الثوب (میں اس کپڑے کا چور ہوں) لیکن اگر وہ صرف یہ کہتا ہے میں چور ہوں۔ (انا سارق) اور مالِ مسروقہ کا نام نہیں لیتا وہ قابلِ سزا نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ "انا سارق" کہہ کر محض ایک سرقہ کا ذکر کرتا ہے جس کا وہ تعین نہیں کرتا۔ اس سے وہ قابلِ گرفت اور قابلِ سزا نہ ہوگا۔

ساتھ ہی لکھتے ہیں۔ اگر سارق پہلے تو سرقہ کا اقرار کرتا ہے پھر انکار کر دیتا ہے اور اس کے بعد پھر اقرار کر لیتا ہے تو اس صورت میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ بلکہ جتنا مال چوری ہوا ہے اس سے اتنی قیمت لی جائے گی۔ کیونکہ اس نے پہلے اقرار کر کے، پھر انکار کر کے،

اور پھر اقرار کر کے قاضی کو شک میں ڈال دیا ہے اور شک کا فائدہ بہرحال ملزم کو پہنچے گا۔

اقرارِ جرم کے بارے میں

حدود کی فصل میں مصنف نے اس مسئلے کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے کہ کس جرم پر کیا سزا دی جائے گی اور یہ کہ جرم کا اقرار کس کے سامنے قابلِ مواخذہ اور لائقِ عقوبت ہوگا۔ فرماتے ہیں:

واقرارہ عند غیر القاضی لیس بشیٔ۔

یعنی قاضی کے علاوہ جرم کا اقرار اگرچہ کسی کے سامنے بھی کیا جائے، کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

فقہی لحاظ سے مصنف کے نزدیک کسی الزام کے فیصلے کی اصل جگہ قاضی کی عدالت ہے جو اقرار قاضی کے سامنے کیا جائے گا، وہی صحیح اور قابلِ اعتماد ہوگا۔ اس کے علاوہ خواہ کسی جگہ جرم کا اقرار کیا جائے قابلِ گرفت نہ ہوگا۔

لا الٰہ الا اللہ کہنے سے مریض کا انکار

فقہائے عظام نے تمام معاملات میں مریض اور تندرست کی ذہنی اور جسمانی غور و فکر کی کیفیتوں کے تفاوت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور بعض بنیادی اہمیت کے مسائل میں بھی ان دونوں کو ایک ہی سطح پر لانے سے صاف انکار کیا ہے مثلاً الفاظِ کفر کی بحث میں مصنف فرماتے ہیں:۔

اذا قیل للمریض قل لا الٰہ الا اللہ فقال لا اقول لا یکفر

اگر مریض سے کہا جائے کہ لا الٰہ الا اللہ کہو اور وہ جواب دے کہ میں نہیں کہتا تو (انکار کی وجہ سے) اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

مطلب یہ کہ مریض پر مختلف اوقات میں مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس وقت کس کیفیت میں ہو، لہٰذا اس کا کلمۂ توحید پڑھنے سے انکار شرعی نقطۂ نگاہ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ بات مصنف فتاویٰ کی وسعتِ قلب اور انسانی نفسیات کو سمجھنے کی دلیل ہے۔ اسی لیے منقول ہے کہ کوئی شخص مرض الموت میں مبتلا ہو تو اس سے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ کلمۂ شہادت پڑھو۔ بلکہ اس کے سامنے خود کلمۂ شہادت پڑھنا چاہیے۔ کیا معلوم وہ اس وقت کس کیفیت

سے دوچار ہو اور انکار کر دے تو لوگوں پر کیا اثر مترتب ہو۔

استعمالِ الفاظ میں احتیاط کی تاکید

اس ضمن میں فتاوٰی کے مصنف علّام نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ الفاظ کے استعمال میں حتی درجہ احتیاط سے کام لیا جائے اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالی جائے جس سے دوسرے کی دلشکنی ہوتی ہو یا اسے ذہنی اذیت پہنچنے کا احتمال ہو۔ کسی کو کافر کہنا اور اس کے اسلام اور ایمان میں شک کرنا مصنف کے نزدیک انتہائی غلط بات ہے اس سے زبان کو محفوظ رکھنا چاہیے۔ مصنف لکھتے ہیں، نہ "اللفظ الشنیع" زبان سے نکالنا چاہیے اور نہ وہ لفظ نکالنا چاہیے جو "تشبہ بالشنیع" ہو۔

لقولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیقل خیرا او لیصمت

کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے یا تو اچھی بات زبان سے نکالنا چاہیے، یا خاموش رہنا چاہیے۔

حالتِ سفر میں مرنے والے کا مال

مصنف نے "لقطہ" کی فصل میں بعض عجیب باتیں بیان کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

غریب مات فی دار رجل فلیس لہ وارث معروف وخلف مالا یساوی خمسۃ دراھم وصاحب الدار فقیر فلہ ان یتصدق بہا علی نفسہ لانہ بمنزلۃ اللقطۃ۔

یعنی ایک شخص حالتِ سفر میں ایک شخص کے گھر میں وفات پا گیا۔ اس کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اس نے پانچ درہموں کے برابر مال چھوڑا ہے اور گھر کا مالک (جہاں وہ فوت ہوا ہے) تنگدست ہے۔ اب گھر کے مالک کو چاہیے کہ اس مال کو بطور صدقہ کے اپنے پاس رکھ لے، اس لیے کہ وہ مال لقطہ کے حکم میں ہے۔

مصنف کا مطلب یہ ہے کہ متوفی تھوڑا بہت مال کسی اجنبی کے گھر چھوڑ کر مر جائے تو صاحب خانہ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ گھر کا مالک اگر تنگدست ہے تو اس مال کو اپنے آپ پر صدقہ سمجھ کر خرچ کر سکتا ہے، کیونکہ اس مال کی حیثیت "لقطہ" کی سی ہے اور لقطہ اس مال کو کہتے ہیں جو زمین پر پڑا ہوا کسی کو مل جائے۔

دعا کے بارے میں

مصنف نے دعا کی فصل میں دعا مانگنے کے طریقے اور آداب ذکر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اللہ کے حضور صاف دل لے کر آنا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر احضار قلب اور کامل طور پر توجہ الی اللہ نہ ہو سکے تو دعا مانگنے سے گریز کر لیا جائے۔ اللہ سے دعا بہر حال مانگنی چاہیے۔ دل کی کیفیت اگرچہ کچھ بھی ہو۔ اس ضمن میں مصنف کے الفاظ یہ ہیں:

رجل یدعو وھو ساھی القلب ولا یمکنہ احضار القلب فالدعاء افضل من ترکہ۔

ایک شخص اللہ سے دعا مانگتا ہے اور اس کا دل غفلت و بے پرواہی کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے (باوجود کوشش کے) حضور قلب اس کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے لیے دعا مانگنا، دعا نہ مانگنے سے افضل ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے مصنف عام لوگوں کی قلبی کیفیت سے آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر شخص کے لیے دعا کے وقت اپنے دل اور ذہن کو حاضر رکھنا ممکن نہیں۔ بہت سے لوگ یہ سمجھ کر دعا مانگنا ہی ترک کر دیتے ہیں کہ جب اس کے آداب ہی پورے نہیں ہو سکتے تو خالی مانگنے سے کیا فائدہ۔ مصنف نے ایسے لوگوں کی دلجوئی کرنے کی سعی کی ہے اور انھیں ڈھارس بندھائی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کے حضور اگرچہ دل کی کسی کیفیت سے ہو) نہ مانگنے سے مانگنا افضلیت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مصنف محض زاہد خشک نہیں ہیں۔ وہ گنہگاروں کو ہر حال میں پُر امید رکھنا چاہتے ہیں۔

گداگر کے سلام کا جواب

فصل فی السلام والمصافحہ میں مصنف فتاویٰ نے اس موضوع سے متعلق کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ سلام کہنا اور اس کا جواب دینا سنت ہے لیکن ہر شخص کے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں مثلاً لکھتے ہیں:۔ السائل علی الباب اذا سلم لا یجب ردہ لانہ شعار السوال لا التحیۃ (گداگر دروازے پر آکر سلام کہے تو اس کے سلام کا جواب دینا ضروری نہیں اس لیے کہ یہ سلام تو سوال کا شعار ہے نہ کہ تحفہ اور ہدیہ کا۔) یعنی سلام تو ایک دوسرے سے بہترین الفاظ کی صورت میں تحائف و ہدایا کے مبادلہ سے تعبیر ہے۔ ظاہر ہے گداگر اور سائل اس ذہن کے حامل نہیں ہوتے ان کا سلام اپنے اندر مانگنے کا مفہوم رکھتا ہے جس سے شریعت کو کوئی تعلق نہیں اس لیے اگر ایسے سلام کا جواب نہ بھی دیا جائے تو حرج نہیں۔

الفتاویٰ الغیاثیہ اس قسم کے بہت سے مسائل کو محیط ہے اور اپنے دور کی ایک بہترین فقہی کاوش ہے۔